ڈاکٹر شاکر علیمی

مولانا رومی اور انسانِ کامل

انسان کو اللہ تعالیٰ نے مختلف قوائے جسمانی و ذہنی سے ترتیب دیا ہے اس میں بے شمار تنظیمی اور تخلیقی صلاحیتیں ودیعت کی ہیں جن کے طفیل وہ ایک طرف اپنے اعمال و افعال مرتب کرتا ہے تو دوسری طرف انسان اور حیوان کی نفسیاتی طریق کو واضح کرتا ہے اس کی تمام تر سرگرمیوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی نفسی ساخت میں کوئی ایسی توانائی ضرور موجود ہے جو عقائد و خیالات، افکار و احساسات، سیاسی و اقتصادی نظام، عائلی و معاشرتی تنظیم، اجتماعی و عمرانی فلسفہ یا شخصی و انفرادی تشکیل غرض زندگی کے ہر شعبے میں اس کی رہنمائی کرتی ہے اور نہ صرف یہ بلکہ یہ توانائی حیات انسانی کے مختلف تاروں کو چھیڑ کر زندگی کے ساز میں سوز کی رمق بھی پیدا کرتی ہے۔ چنانچہ قرآن کریم نے سب سے پہلے اس قوت و توانائی کو روشناس کرایا اور فطرت کے نام سے اسے موسوم کیا۔

فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیھا (سورہ روم)

"اللہ کی وہ فطرت جس پر اس نے لوگوں کو پیدا فرمایا"

امام راغب اصفہانی نے مفردات القرآن میں فطرۃ اللہ کے معنیٰ اس طرح بیان کئے ہیں۔

"اللہ کی فطرت سے مراد وہ قوت ہے جو ایمان کی معرفت سے
اس میں بھر دی گئی ہے"

گویا یہی قوت و توانائی خصائص انسانی کا ماخذ اور تسخیر کائنات کا پیش خیمہ ہے فطرت کی رونمائی سے انسان کی نفسی ساخت نورانی بن جاتی ہے زندگی مادہ کی پیداوار نہیں رہتی بلکہ اسکا سرچشمہ ماورائے مادہ قرار پاتا ہے اور مغربی مفکرین کے وہ تمام نظریات باطل ہوجاتے ہیں جن کی بدولت انسان نورانی الاصل ہونے کے بجائے حیوانی النسل قرار دیا گیا (ڈارون) یا فطرت کی لطافت جبلت کی کثافت سے بدل دی گئی (میگڈوگل) اب مادیت و روحانیت کی آمیزش اور ایمان و وجدان کے ذریعہ ہی انسان کو اس کے منصب عظمیٰ کے فرائض کا احساس دلایا جائے گا جس کے تحت ربانی توانائی کی نیابت اور کائنات کی قیادت کی تمام ذمہ داریاں روز ازل ہی اس کے سپرد کر دی گئیں تھیں ۔ انی جاعلٌ فی الارض خلیفہ درحقیقت انسان کا کام صحیفہ کائنات کی تفسیر بیان کرنا نہیں بلکہ موجودات کو تسخیر کرنا ہے مولانا رومی فرماتے ہیں ؎

بزیر کنگرۂ کبریاش مردانند فرشتہ صید و پیمبر شکار و یزداں گیر

مولانا جلال الدین رومی علیہ الرحمۃ کے نزدیک انسان کا منتہائے کمال یہ نہیں کہ وہ اپنی ہستی کو فنا کر کے ہستی مطلق میں جذب کر دے بلکہ شرف انسانیت یہ ہے کہ آدمی اپنے اندر زیادہ سے زیادہ شان دلفریبی اور قوت انجذاب پیدا کر کے ذات مطلق کو اپنے میں جذب کرلے تخلقوا باخلاق اللہ کا مفہوم بھی یہی ہے مولانا کی تمام تر شاعری کا مطالعہ کریجئے تو یہ حقیقت بہت واضح انداز میں سامنے آئیگی کہ انہوں نے حیات انسانی کے تمام شعبوں میں انسان کی تفسیر بیان کی ہے اور فلسفیانہ نقطۂ نگاہ سے انسان کے ان تمام اعمال و افعال کا جائزہ پیش کیا ہے جس کے تحت وہ نورانی الاصل کہلانے کا مستحق قرار دیا جاسکتا ہے اور اسی لیے وہ ایسے انسان کے آرزو مند ہیں جو ربانی توانائی کا حامل ہو، کائنات کے تمام حجابات کو بے نقاب کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو اور احساس خودی کے ساتھ ذات مطلق کو اپنے میں جذب کرنے کی سعی کرتا ہو چنانچہ انہوں نے دیوجانس کلبی کے ایک

واقعے کو نظم کیا ہے جو ایک روز دن کے وقت ہاتھ میں چراغ لے کر کسی گمشدہ شے کو نہایت توجہ اور انہماک کے ساتھ تلاش کر رہا تھا اور وہ گم شدہ شے انسان کے علاوہ اور کوئی نہیں تھی ے

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گرد شہر کز دام و دد ملولم و انسانم آرزوست
زیں ہمرہان سست عناصر دلم گرفت شیر خدا و رستم دستانم آرزوست
گفتم کہ یافت می نشود جستہ ایم ما گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست

گویا مولانا رومی نے ان اشعار کے ذریعہ انسان کامل کی آرزو کی ہے قرآن حکیم نے فطرۃ اللہ کو جن معنوں میں استعمال کیا ہے مولانا اسی کو بنیاد بنا کر اپنے خیالات ترتیب دیئے ہیں انکا منتہائے مقصود یہ ہے کہ نفس انسانی میں لا متناہی ممکنات موجود ہیں اور کائنات فقط اس عالم مادی کا نام نہیں بلکہ مرکز خلاق کے گرد لا متناہی عوالم پائے جاتے ہیں ہر لمحہ ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں اس لئے ان عوالم پر اتنا تصرف و تسلط قائم کرنے اور ربانی توانائی کو حیوانی جبلتوں پر غالب لانے کے لئے معرفت ذات ضروری ہے کیونکہ غائت حقیقت صرف ایک ہی ہے جو ساری کائنات پر محیط ہونے کے سبب سے ہماری ذات سے نزدیک تر ہے نحن اقرب الیہ من حبل الورید اور نہ صرف یہ بلکہ ہماری ذات اس کی صفات سے متصف ہے اب معرفت ذات حاصل کرنے کے لئے اپنی ذات کی معرفت ضروری ہے جو حکمت و مشیت الٰہی سے ہم آہنگی کے باعث انسان کو الوہیت سے بہت قریب کر دیتی ہے ے

در گذر از نام و بنگر در صفات تا صفاتت رہ نماید سوئے ذات

ذات شخص کی معرفت حقیقتاً ذوق نمو کا وہ فطری قانون ہے جو کائنات کی ہر شے میں جاری و ساری ہے حیات و کائنات میں ایک قانون کلی یہ ہے کہ عروج و ترقی کیلئے ہستی ادنیٰ کسی وجود برتر سے ہم کنار و ہم آہنگ ہو، اور یہ ہم آہنگی باعتبار صفات کے ہے چنانچہ مولانا اسی قانون کو کئی مثالوں سے واضح کرتے ہیں مثلاً سیل کا دریا میں گر کر دریا بن جاتا۔ دانے کا مٹی میں مل کر کھیت بن جانا، روٹی کا جسم میں پہنچ کر انسان کی جان

اور شعور میں تبدیل ہوجانا، موم کا آگ سے پرانوار ہوجانا یا سرمہ کا آنکھ میں پڑکر بینائی بن جانا ہے

سیل چوں آمد بدریا بحر گشت — دانہ چوں آمد بزرع گشت کشت
چوں تعلق یافت نان بابوالبشر — نان مردہ زندہ گشت و با خبر
موم و ہیزن چوں فدائے نار شد — ذات ظلمانی او انوار شد
سنگ سرمہ چوں کہ شد در دیدگاں — گشت بینائی شد آنجا دیدہ بان
اے خنک آں مردہ کز خود رستہ شد — در وجود زندۂ پیوستہ شد

محض اسی لئے انسان بھی عالم مادی کی تنگ دامانی کے سبب ماورائے مادہ رجوع کرتا ہے جو زمان و مکان کی قیود سے آزاد ہے اور اس طرح وہ ذات مطلق سے مربوط ہوجاتا ہے۔ منکرین اسلام میں عبدالکریم جیلی بھی یہی خیالات پیش کرتا ہے وہ کہتا ہے کہ انسان بجائے خود ایک عالم ہے جو خدا اور فطرت دونوں کا مظہر ہے انسان کی ہستی ذات باری کی خارجی شکل ہے بغیر انسانی وجود کے ذات مطلق اور کائنات فطرت میں ربط قائم نہیں ہوسکتا۔ انسان ان دونوں وحدتوں میں اتصالی کڑی کا حکم رکھتا ہے۔ انسان کامل تخلیق کائنات کا اصل مقصد ہے۔ ذات انسانی کے توسط سے ذات مطلق خود اپنا مشاہدہ کرتی ہے اس لیے کہ سوائے اس کے کسی اور مخلوق میں یہ صلاحیت نہیں کہ وہ صفات الٰہیہ کا مظہر بن سکے۔

مولانا رومی فرماتے ہیں کہ انسان اگرچہ خاک پر جنم لیتا ہے لیکن اس کی اصل فطرت روحانیت کے سمندر میں غوطہ زن رہتی ہے۔ وہ یہ نہیں کہتے کہ انسان اپنے وجود کو مطلق فنا کرکے واصل حق ہوجائے بلکہ انکا کہنا یہ ہے کہ انسان کامل ہمیشہ اپنی انفرادیت کو پیش نظر رکھتا ہے اس کے لئے وہ دریا اور مچھلی کی مثال دیتے ہیں جو اپنی زندگی کے لئے دریا کی محتاج ہو اور اس کے اندر غرق رہتی ہے باوجود اس کے اسکا اپنا وجود برقرار رہتا ہے البتہ دونوں میں کامل درجہ کا اتصال قائم ہوجاتا ہے اسی طرح انسان کامل بھی فنا فی اللہ ہونے کے باوجود اپنی انفرادیت کو برقرار رکھتا ہے لیکن وہ ذات مطلق سے کامل

توافق و ہم آہنگی پیدا کرلیتا ہے اور اس طرح وہ ذات حق سے متصل بھی ہوا اور منفصل بھی ؎

متصل نے منفصل اے بکمال بلکہ بے چون و چگونہ اعتلال
ماہیانیم و تو دریائے حیات زندہ ایم از لطفت اے نیکو صفات
تو نگنجی در کنارے فکرتے نے بمعلولی قرین با علتے

مذکورہ تمام بحث کا حاصل یہ ہے کہ مولانا رومی کے نزدیک انسان کامل وہی ہے جو اپنی ذات کی معرفت حاصل کرکے حقیقت اقصیٰ سے ہم آہنگ ہوجائے اب سوال یہ ہے کہ معرفت نفس یا ذات کے لئے کون سے طریقے اختیار کئے جائیں اس کے لئے ہم پہلے یہ عرض کرچکے ہیں کہ فطرت خود اس کی رہنمائی کرتی ہے قرآن حکیم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعے میں اس بات کو بخوبی بیان کیا ہے اور علامہ اقبال اپنے ایک خطبے میں اس طرح اس کی وضاحت کرتے ہیں۔

"انسان کی ارتقائی کوششوں میں خدا اسکا معاون ہوتا ہے بشرطیکہ ہمت اور انقلاب کی ابتدا انسان کی طرف سے ہو قرآن کی واضح تعلیم یہی ہے کہ خدا انسان کی حالتوں کو نہیں بدلتا جب تک وہ پہلے اپنے اندر انقلاب نہ پیدا کرے اگر سعی انقلاب و ارتقا نہ ہو تو انسان کی حیثیت جمادات کی سی رہ جاتی ہے تمام ترقی کا مدار اس پر ہے کہ انسان اپنے ماحول سے خواہ وہ مادی ہو یا غیر مادی از روئے علم صحیح رابطہ قائم کرے جیسی ادراک اور عقل جو محسوسات میں تنظم تلاش کرتی ہے علم کے مآخذ ہیں۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ آدم کو اشیاء کا علم عطا کیا گیا اس کی بدولت اس کو ملائکہ پر فوقیت حاصل ہوئی جس کے معنی ہیں کہ ناظم قوتیں علم اشیاء سے مطیع ہوتی اور انسان کے سامنے سربسجود ہوتی ہے قرآن تمام مظاہر فطرت کو آیات الٰہی قرار دیتا ہے اسی علم سے عرفان بھی پیدا ہوتا ہے اور قوت تسخیر بھی حاصل ہوتی ہے اہل بصیرت اور اہل علم کے لئے خارجی

اور باطنی فطرت ہی حقیقت رسی کا ذریعہ ہے۔"[1]

ڈاکٹر اقبال کے اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ حیات و کائنات کا ہر محسوس پہلو ایک علامت ہے اور جس حقیقت کی وہ علامت ہے وہ خود روح انسانی میں داخل ہے۔ آگے چل کر علامہ اقبال فرماتے ہیں:۔

"از روئے قرآن حقائق کا علم مختلف راستوں سے حاصل ہوتا ہے حسی ادراک اور تعقل اس کا ایک اہم راستہ ہوتا ہے یہاں علم محسوسات اور معقولات کے ذریعہ سے حاصل ہوتا ہے یہ ذریعہ بالواسطہ ہے اس کے علاوہ نفس انسانی پر حقیقت حیات براہ راست بھی منکشف ہوتی ہے قرآن میں مطالعہ فطرت کا حوالہ اسی حقیقت کو تسلیم کرنے کے لئے ہے کہ انسان کا خارجی فطرت سے بھی ایک قریبی اور گہرا تعلق ہے اس راستے کا فہم انسان کو اس قابل بنا دیتا ہے کہ وہ فطرت کی قوتوں سے استفادہ کر سکے۔ مادی قوتوں پر غلبہ حاصل کرنا فی نفسہ مقصود نہیں اس کی غرض یہ ہے کہ انسان روحانی زندگی کے مقصد اشرف کے حصول میں ترقی کا قدم اٹھا سکے۔ قرآن ایک ہی آیت میں سمع و بصر کے ساتھ فواد یعنی دل کو بھی ذریعہ معرفت قرار دیتا ہے ـــــ مذہبی وجدان کے ذریعہ کشف حقیقت نوع انسانی کا ایک وسیع تجربہ ہے۔"[2]

حقیقت یہ ہے کہ انسان کو عقل و تجربہ کی رہنمائی عطا کی گئی اور حقائق اشیاء کا علم بھی دیا گیا جس کے ذریعہ وہ تمام محسوسات کو اپنے دائرۂ اختیار میں لے لیتا ہے لیکن ماورائے محسوسات بھی ایک عالم موجود ہے وہ عالم غیب ہے عالم الغیب والشہادۃ ھوالرحمٰن الرحیم عالم غیب کی اشیاء اگرچہ خلاف عقل نہیں ماوراے عقل ضرور ہیں عقل اس کے ادراک سے قاصر ہے مولانا جہاں عقل کے فضائل بیان کرتے ہیں وہاں وہ عقل کی نارسائی کے بھی مدعی ہیں ان کا خیال ہے کہ انسانی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے اعضاء

---

[1] ذکر اقبال از ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم [2] ایضاً

وجوارح جس طرح ایک ذریعہ ہیں اسی طرح عقل بھی ایک معتبر آلہ ہے اس کے بغیر انسان اور گدھے میں تمیز مشکل ہے ؎

آدمی را عقل باید در بدن ورنہ جاں در کالبد دارد حمار

مثنوی میں جگہ جگہ عقل کی نارسائی کا ذکر ملتا ہے اور خصوصاً اس وقت جب وہ اس کو عشق کے بالمقابل لاتے ہیں اور جہاں کہیں وہ عقل کے فضائل بیان کرتے ہیں تو اس سے مقصود عقل کلی ہوتی ہے عقل جزوی نہیں وہ اس سلسلہ میں قدیم فلاسفہ کے نظریات کے ہم نوا ہیں مثلاً ارسطو نے عقل کو ماہیت وجود قرار دیا، وہی اس کے نزدیک اصلیت کی اساس ہے اس کے یہاں خدا کا تصور بھی عقل کلی کا تصور ہے۔ مولانا عقل کو حکمت و عرفان سے تعبیر کرتے ہیں ان کے نزدیک حکمت عشق کی منزل تک پہنچا دیتی ہے جو درحقیقت وحی والہام کا مقام ہے جس کے ذریعہ وہ خود لوح محفوظ بن جاتا ہے جس پر ازلی حقائق ثبت ہیں ؎

منبع حکمت شود حکمت طلب فارغ آید او ز تحصیل و سبب

لوح حافظ لوح محفوظے شود عقل او از روح محفوظے شود

لیکن عقل جزوی انکشاف حقیقت کے لئے غیر ضروری ہی نہیں بلکہ بہت سی وجوہ سے سدراہ بھی ہے مثلاً عقل کی پہلی مجبوری تجزیہ ہے یہ کسی بھی حقیقت کو بغیر تجزیہ کے نہیں سمجھ سکتی اور اس طرح وہ وحدت کو کثرت میں تبدیل کر دیتی ہے ذات شخص کو عقل جسم و روح کے تضاد میں پیش کر کے وجود شخصی کو معدوم کر دیتی ہے یا اسی طرح انکار، اثبات اور تضاد میں اصل حقیقت کو محبوس کر دیتی ہے وہ تعینات مکان کی بھی پابند ہوتی ہے عقل کی ان مجبوریوں کے پیش نظر ہمارے سامنے لاتعداد مثالیں ہیں وحدت و کثرت، عرض و جوہر، علت و معلول اور سبب و مسبب وغیرہ وغیرہ مثنوی میں عقل کی ان مجبوریوں سے متعلق بہت سے اشعار موجود ہیں ایک جگہ مولانا فرماتے ہیں ؎

گر بہ استدلال کار دیں بدے فخر رازی راز دار دیں بدے

پائے استدلالیاں چوبیں بود پائے چوبیں سخت بے تمکیں بود
وانکہ اوایں نور را بینا بود شرح او کے کار بوسینا بود

جب یہ بات واضح ہوگئی کہ عقل کاشف حقیقت نہیں تو پھر وجدان ہی ایسی چیز رہ جاتی ہے جس سے ذات شخص کا ادراک ہو سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں برگسان نے بڑی تحقیق اور نکتہ آفرینی سے کام لیا ہے جس سے علامہ اقبال بھی متاثر ہوئے ہیں اور علمی سطح پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ کسی حد تک مولانا رومی اس کے پیش رو تھے، برگسان عقل استدلالی کو جو استخراج اور استقراء سے کام لیتی ہے اس عالم مادی میں جسمانی افادیت کا حامل تو سمجھتا ہے لیکن حقیقت کے ادراک کے لئے اس کو عاجز و مجبور پاتا ہے اور وجدان کو ہی انکشاف حقیقت کا بڑا ذریعہ خیال کرتا ہے اس نے وجدان کی جو خصوصیات بیان کی ہیں اسکا ماحصل یہ ہے کہ عالم کائنات میں عقل کی کارفرمائی مخصوص تصورات کے تحت ہوتی ہے یہ تصورات کسی بھی شے کے انہی اوصاف کو ظاہر کرسکتے ہیں جو تمام اشیاء کے درمیان مشترک ہوں مثلاً شخصی زندگی میں مشترک خیالات، احساسات اور واردات وغیرہ لیکن وہ ان تمام ذاتی صفات کو سمجھنے سے قطعی قاصر ہے جو کسی شے یا شخص سے متعلق ہونے کے ساتھ ساتھ بے مثل بھی ہے اس کے خیال میں ذات شخص کو اگر تعقل کے ذریعہ سمجھنے کی کوشش کی جائیگی تو وہ حرف موہوم نقطہ کی صورت میں ہمارے سامنے آئے گی اس لئے وجدان کے علاوہ کوئی ایسا ذریعہ نہیں جس سے حقیقت ذات کا انکشاف ہوسکے وحدت وکثرت کے وہ تمام حقائق جو ذات شخص سے متعلق ہیں اور درونِ سینہ مضمر ہونے کے ساتھ ساتھ ہر لحظہ متغیر و منقلب ہیں صرف اور صرف وجدان ہی کے ذریعہ سمجھے جا سکتے ہیں برگسان نے وجدان کے ذریعہ تسلسل حیات میں زورِ زندگی کا پتا بھی دیا ہے جس کو سمجھنے کے لئے برگسان کے نظریہ زمان ومکان کو سمجھنا ضروری ہے۔

برگسان جس وجدان کا ذکر کرتا ہے مولانا رومی حقیقت تک رسائی کے لئے اس کو بھی معذور خیال کرتے ہیں اس لئے کہ برگسان تسلسل حیات میں زورِ زندگی کو ہی اصل حقیقت کے مترادف سمجھتا ہے حالانکہ زورِ زندگی خود ایک بلند تر حقیقت سے متعلق ہے مولانا جب عقل

وجدان سے ہٹ کر قلبی رجحانات اور ذوق طلب کا جائزہ لیتے ہیں تو محسوس کرتے ہیں کہ تمام اشارات و کنایات، استعارات و تشبیہات، تصورات و بیانات مقام ذات کی معرفت میں ناقص و نارسا ہیں البتہ جذبہ عشق اس طرف رہ نمائی کرتا ہے ؎

گرچہ تفسیر زباں روشن گر است — لیک عشق بے زباں روشن تر است
چوں قلم اندر نوشتن می شتافت — چوں بعشق آمد قلم بر خود شگافت
محرم ایں ہوش جز بے ہوش نیست — مر زباں را مشتری جز گوش نیست

ایک جگہ اور فرماتے ہیں ؎

دل راز جاں برکندہ ام با چیزے دیگر زندہ ام — عقل و دل و اندیشہ را از بیخ و بن سوزیدہ ام

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم لکھتے ہیں :-

"تمام کائنات اس لئے مائل بہ ارتقار ہے کہ وہ خدا کی طرف عود کرنا چاہتی ہے اس تنزلاتی اور تدریجی نظام میں وہ جذبہ جو عالم کے اجزار میں اتحاد پیدا کرتا ہے جذبہ عشق ہے لیکن محض اتحاد اجزار اور نظم عالم غایت حیات و کائنات نہیں ہر ذرے کا مقصود عروج و صعود الی اللہ ہے مادہ سے خدا تک نردبان ہے اور جس ہستی کو بھی خدا کی طرف جانا ہے اسے پا بہ پا قدم بہ قدم ترقی کرنا ہے مادۂ آب و خاک میں جب ایک بیج ڈال دیا جاتا ہے تو اس کے گرد و پیش کا تمام مادہ جو جامد و بے جان معلوم ہوتا تھا نبات کی صحبت میں اپنی ہستی کو فنا کر کے نخل کی صورت میں مبدل ہو جاتا ہے - - - - - - - اس طریقے سے عشق، اعلیٰ تر اقدار حیات کا خلاق بن جاتا ہے اور عشق کی بدولت ہستی کا ہر ذرہ وسیع تر اتحاد پیدا کرنے اور اوپر کی طرف ترقی کرنے پر مائل ہے[1]"

گویا عشق کے ذریعہ عقل سے بھی ماوراجانے کا راستہ پیدا ہو جاتا ہے مولانا فرماتے

---

[1] فکر اقبال ص ۳۳۹

ہیں ؎

عقل گوید شش جہت حداست و بیرون راہ نیست | عشق گوید ہست راہ رفتہ ام من بارہا
عاشقانِ خستہ دل را در دَرونست ذوقہا | عاقلان تیرہ جاں را در دروں انکارہا

مولانا نے ان اشعار کے ذریعہ حس قلبی اور روحی تشنگی کی طرف توجہ دلائی ہے اور جس کی بنا پر حقیقت اقصٰی کی معرفت کا حصول ممکن ہے اس کی تائید میں قرآن حکیم میں بکثرت اشارات موجود ہیں مثلاً و للہ الاسماءُ الحسنیٰ فادعوہ بہا

؎ درمدرسۂ آدم با حق چو شدی محرم | بر صدر فلک بنشیں تدریس ز اسما کن

اس کے علاوہ سورۃ بقرہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے والذین آمنو اشد حبا للّٰہ "جو لوگ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں ان کے دلوں میں سب سے زیادہ اللہ کی محبت ہوتی ہے" ایمانی قوت محبت کی شدت سے پیدا ہوتی ہے اور عشق جو صداقت کا سرچشمہ ہے انسان کے افعال و اعمال میں ہم آہنگی پیدا کر دیتا ہے۔ حیات و کائنات میں حرکت و ارتقاء عشق ہی کے سبب سے ہے قرآن حکیم میں خداوند قدوس کی بہت سی صفات بیان کی گئی ہیں ان سب میں رحمت و ربوبیت کی صفات سب سے زیادہ نمایاں ہیں رحمت کی صفت عین ذات ہے جو خلاقی اور ربوبیت کی اساس ہے۔ اور اس کا دوسرا نام عشق ہے انسان کامل عشق کی ابدی حقیقت سے واقف ہوتا ہے اس لئے وہ اخلاق حسنہ کا پیکر ہوتا ہے کیونکہ اخلاق حسن محبت کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتا اللہ جمیلٌ ویحب الجمال مولانا کے نزدیک انسانِ کامل عشق کی ہمہ گیری کو محسوس کر کے اس کا پیکر بن جاتا ہے کیونکہ عشق حیات بھی ہے اور مصدر وجود بھی معرفت ذات بھی ہے اور مظاہر وجود بھی فرماتے ہیں کہ عشق مصدر وجود ہونیکے سبب انسانی اعمال میں فطرت الٰہی کو جذب کر دیتا ہے اور اس قانونِ تجاذب کا کائنات کا ذرہ ذرہ پابند ہے کائنات میں اجسام و اجرام میں باہمی کشش بھی عشق ہی کی رہین منت ہے ؎

جملہ اجزائے جہاں زاں حکم پیش | جفت جفت و عاشقان جفت خویش
ہست ہر جزوے بعالم جفت خواہ | راست ہم چوں کہربا و برگ کاہ

آسماں گوید زمیں را مرحبا با توام چو آہن و آہن ربا

ارتقائے حیات انسانی میں عشق ہی صداقت کا سرچشمہ ہونے کے سبب بقائے حیات ہے، سوز زندگی ہے، اسی کے دم سے درونِ سینہ کی ساری حقیقتیں انسان پر منکشف ہو جاتی ہیں ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب رقمطراز ہیں۔

> "عارف رومی کے نزدیک عشق فقط انسان کا جوہر نہیں بلکہ حیات و کائنات کی قوت تخلیق اور ذوق ارتقاء عشق ہی کے رہین منت ہیں زمانہ حال میں اس نظریہ حیات کے سب سے زیادہ بلیغ مبلغ علامہ اقبال گزرے ہیں جو اس بارے میں اپنے مرشدوں کے ہم پایہ ہیں مولانا اس کو دلنشین کرنے کیلئے کبھی تشبیہات سے کام لیتے ہیں اور کبھی مظاہر کائنات کی طرف توجہ دلاتے ہیں ـــــــــ مولانا فرماتے ہیں کہ مکانی وسعتیں محض مظاہر کی وسعتیں ہیں جن کی حقیقت بس ایسی ہے جیسا کہ سمندر کے اوپر جھاگ حقیقت حیات بحر بے پایاں عشق ہے افلاک کا وجود اور ان کی گردشیں اسی کی بدولت ہیں اور بالقوئے اس عشق کا سب سے بڑا مرکز و محل انسان کا دل ہے[۱]"

بلا شبہ یہ قلب انسانی ہی ہے جو مادیت کے لئے غیر مادی ذرائع علم و ادراک کا ابتدائی مقام ہے جو تمام جواہر کی تدبیر کرتا ہے جس میں لطف روحانی و باطنی قوت موجود ہے اسی قوت و توانائی کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فراست کے لفظ سے تعبیر کیا ہے اتقوا فراسۃ المومن فانہ ینظر بنور اللہ اور انسان کامل کی خصوصیت میں جس کو شمار کیا ہے اس لئے کہ انسان کامل میں قلب ہی ایک ایسی چیز ہے جسمیں عشق کی شورانگیز لہریں پیدا کر دینے کے بعد حقیقت مطلق اپنی تمام تر صفات کو اس میں وحید و بے مثل کر دیتی ہے اور پوری کائنات از خود اپنے تمام راز ہائے سربستہ اس پر واشگاف کرنے لگتی ہے مولانا رومی کے نزدیک انسان کے آئینۂ قلب پر جب عشق کی حقیقتیں منعکس ہونے لگتی ہیں تو وہ کمال کی تمام حدوں

۱؎ تشبیہات رومی ص۵۲۵

کو چھونے کے قابل ہو جاتا ہے پھر اس کو آب و خاک سے چنداں نسبت نہیں رہتی اس کا کوئی عمل آئین الہٰی کے خلاف نہیں ہوتا اور اشیاء کی حقیقت کا راز اس کی ذات پر منکشف ہونے لگتا ہے۔

انکشاف حقیقت یا معرفت، حکمت کے عرفان کا نام ہے جو علم سے حاصل ہوتا ہے اور یہ نعمت سب سے اوّل انسان کو ودیعت کی گئی تھی جس کی بنا پر اسے ملائکہ پر تفوق حاصل ہو سکا، گویا انسان کامل کا جوہر علم ہوا اور چونکہ علم کی کوئی حد نہیں اس لئے معراج انسانیت کی بھی کوئی حد نہیں علم صحیح فطرت اللہ کے قوانین سے آتا ہے مولانا فرماتے ہیں ؎

آدم خاکی زحق آموخت علم تا بہفتم آسماں افروخت علم
نام و ناموس ملک را در شکست کوریٔ آں کس کہ با حق در شک است
خاتم ملک سلیمان است علم جملہ عالم صورت و جان است علم

انسان حواس سے کائنات کا ادراک کرتا ہے لیکن یہ اسکا فی نفسہ ذریعہ علم نہیں نور دل یا بصیرت ذریعہ علم ہے لا تدرکہ الابصار وھو یدرک الابصار

؎ نور نورِ چشم خود نور دل است نور چشم از نور دلہا حاصل است
باز نور نورِ دل نور خدا است کوز نور و عقل و حس پاک و جدا است

کائنات کی ساری حقیقتیں قلب انسانی پر منعکس ہوتی ہیں لیکن یہ اسی وقت ہوتی ہیں جب قلب صاف و مصفا ہو اور قلب جب مصفا ہو جاتا ہے تو وہ انسان کے مادی جسم اور مکانی حدود کا پابند نہیں رہتا بلکہ اس کا مقام فراز عرش پر ہوتا ہے ؎

تو ہمی گوئی مرا دل نیز ہست دل فراز عرش باشد نے بہ پست
آئینہ دل چوں شود صافی و پاک نقش ہا بینی بروں از آب و خاک
روزنِ دل گر گشاد است و صفا می رسد بے واسطہ نور خدا

سوال یہ ہے کہ آئینہ دل جو عشق کا مرکز ہے کس طرح مصفا کیا جائے اس کے لئے مولانا فرماتے ہیں کہ تزکیہ نفس سے دل کو صاف کیا جائے دل جو جسم انسانی کا جوہر ہے اخلاق میں پاکیزگی

اور اعمال میں بے غرضی و بے لوثی سے ہی مصفا ہو سکتا ہے تزکیہ نفس کے بعد صحیح علم حاصل ہوتا ہے ہوا و ہوس، طمع و حسد، بغض و عداوت، اغراض کی کج بینی اور اعمال و افعال کی کج روی دل کو زنگ آلود کر دیتی ہے اور حقیقت اس پر منعکس نہیں ہوتی علم تو نور الٰہی ہے جو تزکیہ نفس کے بعد حاصل ہوتا ہے اور وہ علم جو تزکیہ نفس کے بعد حاصل ہوتا ہے مبدل بہ حکمت ہو جاتا ہے اسی لئے اللہ تعالیٰ نے حکمت کو خیر کثیر کہا ہے من یوتی الحکمۃ فقد اوتی خیراً کثیرا مولانا فرماتے ہیں صحیح علم تزکیہ نفس ہی سے حاصل ہوتا ہے جو آب حیات ہے۔ ؎

خویش را صافی کن از اوصاف خود — تا بہ بینی ذات پاک وصاف خود
بینی اندر دل علوم انبیاء — بے کتاب و بے معید و اوستا
بے صحیحین و احادیث و رواۃ — بلکہ اندر مشرب آب حیات
رو میاں آں صوفیانند اے پسر — نے ز تکرار و کتاب و نے ہنر
لیک صیقل کردہ اند آں سینہ ہا — پاک ز آز و حرص و بخل و کینہ ہا

مولانا کے نزدیک انسان کامل ذات مطلق سے ہم آہنگ ہوتا ہے اور یہ ہم آہنگی اس کو معرفت ذات سے حاصل ہوتی ہے اس لیے کہ وہ صفات الٰہیہ سے متصف ہے اور معرفت ذات عشق سے حاصل ہوتی ہے جو حصول معرفت کا ذریعہ ہے اور قلب انسانی میں موجزن رہتا ہے بشرطیکہ قلب انسانی صیقل کیا ہوا ہو اس کے لئے تزکیہ نفس ضروری ہے پس معلوم یہ ہوا کہ انسان کامل تزکیہ نفس کر کے عشق و وجدان کے ذریعہ منزل مقصود کی طرف گامزن رہتا ہے اس راستہ میں بہت سی تکالیف اور صعوبتوں کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے جس سے وہ قطعاً نہیں گھبراتا بلکہ ہمت و استقلال سے اس کٹھن منزل سے بخیر و خوبی گذر جاتا ہے وہ عرض کی حدود سے نکل کر جوہر کے دائرے میں داخل ہو جاتا ہے پھر اس کا ہر عمل آئین الٰہی کے مطابق ہو جاتا ہے اس کے اعضاء و جوارح اس کا ارادہ اس کا خیال سب حقیقت مطلق سے براہ راست قوت و توانائی حاصل کرتے ہیں وہ فطرت کی تمام تر قوتوں کو اپنے

اندر سمیٹ کر تسخیر کائنات اور نیابت الٰہی کی ذمہ داریوں کا اہل ہو جاتا ہے

مرد خدا شاہ بود زیر دلق		مرد خدا گنج بود در خراب
مرد خدا نیست زبا دوز خاک		مرد خدا نیست زنا روز آب
مرد خدا آن سوئے کفر است ودیں		مرد خدا راچہ خطا و صواب

پس بصورت آدمی فرع جہاں		در صفت اہل جہاں را ایں بداں
ظاہرش را پشہ آرد بہ چرخ		باطنش باشد محیط ہفت چرخ

جانہاں در اصل خود عیسیٰ دم اند		یکزماں زخم اند و دیگر مرہم اند
گر حجاب از جان ہا بر خاستے		گفت ہر جانے مسیح آساستے